© rasailojaraid.com

حضرت معاویہؓ اور خلافت و ملوکیت

ملک غلام علی صاحب

(۵)

حضرت حُجرؓ بن عدی کا قتل

حضرت حُجرؓ بن عدی کے قتل کی جو روداد مولانا مودودی نے "خلافت و ملوکیت" میں بیان کی ہے وہ کتاب کے دو صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا بیشتر حصہ "البلاغ" میں بھی نقل کر دیا گیا ہے، اس لیے اس کا دوبارہ یہاں درج کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ قارئین چاہیں تو اصل کتاب یا "البلاغ" میں اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ "خلافت و ملوکیت" میں یہ واقعہ "آزادیٔ اظہار رائے کا خاتمہ" کے زیرِ عنوان تحریر کیا گیا ہے۔ "البلاغ" میں اس واقعۂ قتل پر بیس صفحوں کا ایک جوابی تبصرہ سپردِ قلم کیا گیا ہے۔ جس کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ حضرت حُجرؓ بن عدی اور کچھ دوسرے "فتنہ پرداز" امتِ مسلمہ میں انتشار برپا کرنا چاہتے تھے، امیر معاویہؓ کے گورنروں اور پولیس سپرنٹنڈنٹ کو گالیاں دیتے اور ان پر پتھر پھینکتے تھے، جنگ کرتے تھے۔ غرض یہ کہ اسلامی حکومت کے خلاف جرمِ بغاوت کے مرتکب تھے اور "ظاہر ہے کہ بغاوت کی سزا موت ہے"۔ یہ واقعہ تاریخ میں جن تفصیلات کے ساتھ مروی ہے، ان کی موجودگی میں جناب محمد تقی صاحب عثمانی کے لیے اصل واقعہ کا انکار تو ممکن نہ تھا۔ مگر میری معلومات کے مطابق عثمانی صاحب غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنے زعم میں حضرت حُجرؓ بن عدی کو ارتکابِ بغاوت کی بنا پر مُباح الدم اور واجب القتل ثابت کرنے میں اپنا پورا زور لگا دیا ہے۔ اس لیے اب یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ پہلے میں اسلام کا قانونِ بغاوت اور اُس کے بنیادی اصول پیش کروں اور پھر عثمانی صاحب سے سوال کروں کہ اگر یہ اصول صحیح ہیں تو ان کی روشنی میں حضرت حُجرؓ اور ان کے ساتھیوں کا خون بہانا کس حد تک روا اور حق بجانب تھا؟

اسلام کا قانونِ بغاوت

اس مسئلے میں ہم سب سے پہلے کتاب اللہ سے رجوع کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں دو آیتیں ایسی ہیں جو محاربہ و بغاوت کے جرائم سے براہِ راست تعلق رکھتی ہیں۔ پہلی المائدہ، آیت ۳۳، دوسری الحجرات، آیت ۹۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہلی آیت کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"سزا اُن لوگوں کی جو لڑائی کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول سے اور دوڑ دھوپ کرتے ہیں زمین میں بغرض فساد، یہ ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا سولی چڑھائے جائیں یا کاٹے جائیں ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمت سے یا زمین سے نکال دیے جائیں۔ یہ اُن کے لیے رسوائی ہے دنیا میں اور اُن کے لیے ہے آخرت میں بڑا عذاب"

اس آیت میں جس جرم کو "اللہ اور اس کے رسول سے محاربہ اور فساد فی الارض" سے تعبیر کیا گیا ہے، اس جرم کی جو تفسیر مفسرین اور ائمۂ مجتہدین نے کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد لوٹ مار، قتل و غارت، رہزنی و ڈکیتی اور اس طرح کی دوسری تخریبی کارروائیاں ہیں جن کے نتیجے میں کسی مقام یا علاقے کا امن و امان تہ و بالا اور نظم و نسق درہم برہم ہو جائے۔ جمہور فقہاء و محدثین کا مسلک یہ ہے کہ اس جرم میں قتل کی سزا صرف اُس حالت میں دی جاسکتی ہے جب کہ مجرم خود قتل کا مرتکب ہوا ہو۔ اس سے کمتر درجے کے جرائم میں اُسے قتل یا صلیب کی سزا نہیں دی جاسکتی۔ اس آیت کی جو تشریح امام ابن جریرؒ نے کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ محاربین سے مراد ایسے چور اور ڈاکو ہیں جو مسلح ہو کر مسلمان بستیوں میں دہشت پھیلائیں اور علانیہ بزورِ شمشیر جان و مال پر دست درازی کریں۔ پھر لکھتے ہیں کہ فان قتلوا قتلوا وان لم یقتلوا واخذوا المال قطعوا من خلاف (اگر یہ مجرم قتل کے مرتکب ہوئے ہوں تو انہیں قتل کیا جائے گا اور اگر یہ قتل کے مجرم نہ ہوں، صرف مال لوٹا ہو تو ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹے جائیں گے)۔ مزید فرماتے ہیں اذا حارب فقتل فعلیہ القتل واذا حارب واخذ ولم یقتل فعلیہ قطع الید۔ (اگر وہ محاربہ کرے اور قتل کرے تو اس کے لیے قتل کی سزا ہے اور اگر وہ محاربہ کرے اور ایسی حالت میں گرفتار ہو جائے کہ اس نے قتل نہ کیا ہو تو اس کی سزا قطع ید ہے)۔ اسی مفہوم کے متعدد اقوال نقل کیے گئے ہیں جن کا مدعا یہی ہے کہ جو مجرم قاتل نہ ہو، اُسے قتل نہیں کیا جاسکتا۔ اس قول کے حق میں ابن جریر یہ حدیث بھی نقل فرماتے ہیں کہ لا یحل دم امرئٍ مسلم الا باحدی ثلاث خلال..... (ایک مسلمان کا خون بہانا صرف تین حالتوں میں حلال ہوسکتا ہے، وہ قتل کرے تو اسے قتل کیا جائے گا، شادی کے بعد زنا کرے تو رجم کیا جائے گا اور اسلام کے بعد مرتد ہو تو قتل ہوگا۔ پھر لکھتے ہیں کہ ارتکاب قتل کے بغیر محض بدامنی اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آمدورفت کو پُرخطر بنانے پر کسی کو قتل کر دینا یہ تقدم علی اللہ و رسول ہے اور ایسی بات ہے جس کا کوئی ذی علم قائل نہیں ہے۔

اس کے بعد ابن جریرؒ نے چند ایسے اقوال بھی نقل کیے ہیں کہ بعض کی رائے کے مطابق امام وقت کو یہ اختیار ہے کہ وہ محاربین کو آیت مذکورہ میں بیان کردہ سزاؤں میں سے جو سزا بھی چاہے دے سکتا ہے، قطع نظر اس کے کہ انہوں نے قتلِ نفس کا ارتکاب کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ لیکن ابن جریرؒ نے نہایت مدلّل طریق پر اس رائے کا ابطال کیا ہے اور لکھا ہے کہ صحیح تاویل یہی ہے کہ عقوبت استحقاقِ جرم کے مطابق ہوگی اور قتل کی سزا صرف اُس محارب کو دی جائے گی جس نے محاربہ کے دوران میں قتل کا جرم کیا ہو۔

تقریباً یہی بات علامہ نظام الدین النیساپوری نے اپنی تفسیر غرائب القرآن میں درج فرمائی ہے۔ ان کی تحقیق بھی یہی ہے کہ آیت میں بیان کی ہوئی ہر سزا ہر محارب کو نہیں دی جاسکتی۔ فرماتے ہیں ھذا المحارب اذا لم یقتل ولم یأخذ المال فقد ھَمّ بالمعصیۃ ولم یفعل وھٰذا لا یوجب القتل (اس محارب نے جب قتل نہیں کیا اور نہ مال چھینا، تو اس نے صرف ارادۂ معصیت کیا تھا، اس کا ارتکاب نہیں کیا تھا، اور اس سے اس کا قتل واجب نہیں ہوتا)۔

امام ابوبکر الجصاص نے "احکام القرآن" میں اس آیت کی جو تشریح کی ہے وہ بھی یہی ہے کہ جو شخص محاربہ میں قتل کا ارتکاب کرے، قتل کی سزا اُسی کو دی جاسکتی ہے۔ ان کے نزدیک بھی آیت میں بیان شدہ سزاؤں میں ایک ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے۔ یعنی جیسا جرم ہوگا، ویسی ہی سزا ہوگی۔ قتل کی سزا قتل ہوگی، سلبِ مال کی سزا قطعِ ید اور قطعِ اَرجُل ہوگی۔ الجصاص نے بھی اپنے استدلال کے حق میں اُس حدیث کو پیش کیا ہے جس میں تین وجوہ کی بنا پر مسلمان کا خون حلال کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین صورتوں کے ماسوا قتلِ مسلم کی نفی فرما دی ہے: فانتفیٰ بذٰلک قتل من لم یقتل من قطاع الطریق (اس بنا پر جس رہزن نے کسی کو قتل نہ کیا ہو، اس کا قتل ممنوع ہو گیا)۔

جس حدیث کا حوالہ ابن جریر اور ابوبکر جصاص نے دیا ہے وہ بخاری، کتاب الدیات میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے: لا یحل دم امرئ مسلم یشھد ان لا الٰہ الا اللہ وانی رسول اللہ الا باحدیٰ ثلاث:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

النفس بالنفس و الثیب الزانی والمفارق لدینہ التارک للجماعۃ ۔ اس حدیث کی تشریح میں حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ تارک جماعت کے تحت باغی بھی آ سکتا ہے مگر اس کا قتل صرف اس صورت میں جائز ہو گا جبکہ اپنا دفاع کرتے ہوئے ہم اُسے قتل کریں (لا یحل قتلہ الا مدافعۃ)۔ آیت محاربہ کا مفہوم بھی ابن حجر کے نزدیک یہی ہے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ محاربہ کی زیادہ سے زیادہ سزا یہ ہے کہ ان قتل قُتِل و حکم الآیۃ فی الباغی ان یقاتل لا ان یقصد الی قتلہ (محارب اگر قتل کرے گا تو قتل کیا جائے گا اور سورۂ حجرات والی آیت جو باغیوں کے بارے میں ہے، اس میں فقط باغی سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے، یہ نہیں کہ اس کے قتل کا قصد کیا جائے)۔ پھر لکھتے ہیں کہ عملِ قومِ لوط اور وطئی بہائم میں قتل کی سزا جن روایات میں مذکور ہے، وہ صحیح السند نہیں اگر ہوں بھی تو یہ افعال زنا میں داخل ہیں اور اس لیے موجب قتل ہوں گے ۔ جن احادیث میں جماعتِ مسلمین کے خلاف خروج پر قتل کی وعید ہے، ان کی تاویل بھی حافظ ابن حجر کے نزدیک وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی، یا پھر ان کا مطلب یہ قرار دیا ہے کہ مجرم کو محبوس کر کے خروج سے روک دیا جائے (المراد بقتلہ حبسہ ومنعہ من الخروج)۔ علامہ بدرالدین عینی نے بھی اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے تقریباً یہی بات بیان فرمائی ہے ۔ لکھتے ہیں کہ بعض حضرات نے اس حدیث میں مذکور تین اشخاص کے ساتھ ایک چوتھے شخص باغی کے قتل کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ پھر فرماتے ہیں اجیب عنہ بانہ انما یجوز دفعہ اذا ادی الی القتل فلا یحل تعمد قتلہ اذا اندفع بدون ذلک فلا یقال یجوز قتلہ بل دفعہ (باغی کے معاملے میں اس بات کا جواب یہ ہے کہ اس کے خلاف صرف مدافعانہ کارروائی جائز ہے خواہ مدافعت کے دوران میں اس کا قتل واقع ہو جائے ۔ لیکن اگر باغی کے مقابلے میں مدافعت قتل کے بغیر بھی ممکن ہو تو قصداً اُسے قتل کرنا جائز نہیں بلکہ اس کے بالمقابل دفاع کیا جائے گا)۔

قرآن مجید کی دوسری دو آیتیں جن میں جرم بغاوت کا ذکر ہے، وہ سورۂ حجرات کی آیات ۹-۱۰ ہیں۔ ان کا ترجمہ یہ ہے :

"اور اگر دو گروہ مومنوں میں سے آپس میں لڑ جائیں تو دونوں کے درمیان اصلاح کرو۔ پھر اگر ایک ان میں سے دوسرے پر چڑھ جائے تو قتال کرو اُس سے جو زیادتی کر رہا ہے یہاں تک کہ وہ لوٹ آئے اللہ کے حکم کی طرف۔ پس اگر وہ باز آ جائے تو دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ مصالحت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرادو اور انصاف سے کام لو۔ مومن تو بھائی بھائی ہیں، پس اپنے دونوں بھائیوں کے مابین صلح کراؤ اور اللہ سے ڈرو، جس سے توقع ہے کہ تم پر رحم ہو گا۔

ان آیات میں صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ باغی فرد یا گروہ کے خلاف قتال (لڑائی) کر کے انہیں اللہ کے حکم کی جانب لوٹنے پر مجبور کیا جائے اور پھر باہم مصالحت اور ملاپ کرادیا جائے۔ ان آیات میں خاتمۂ قتال کے بعد گرفتار شدہ باغی کو قتل کرنے یا کوئی دوسری سزا دینے کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے، اس لیے ان سے بغاوت کی سزائے قتل کا استنباط کسی طرح درست نہیں۔ فقہاء و مفسرین نے جس طرح محاربہ اور بغاوت سے متعلق آیات کی تشریح اور ان سے احکام کی تفریع کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ مائدہ کی آیات میں صرف اُن مجرمین کا ذکر ہے جو عادی پیشہ ورانہ ذہنیت کے ساتھ اور مجرد مادی فوائد و اغراض کے تحت لوٹ مار اور غارت گری کریں۔ اس کے برعکس سورۂ حجرات میں جن باغیوں کا ذکر ہے ان سے مراد وہ لوگ ہیں جن میں مادی اغراض سے زیادہ سیاسی داعیات اور اعتقادی جذبات کارفرما ہوں، خواہ ان کا عقیدہ اور سیاسی مسلک و نظریہ بالکل فاسد ہو یا نہ ہو۔ اس طرح کے لوگ بالعموم اپنے موقف کے حق میں کسی شرعی تاویل کے بل پر اٹھتے ہیں اور ان کے ساتھ بالکل چوروں اور ڈاکوؤں کا سا معاملہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ پھر محارب کا اطلاق تو فردِ واحد یا چند افراد پر بھی ہو سکتا ہے کیونکہ کسی مقام پر مار دھاڑ کے ذریعے سے چند مسلح آدمی بھی بدامنی اور دہشت پھیلا سکتے ہیں، لیکن خروج و بغاوت کے لیے بہرحال ایک معتدبہ جمعیت درکار ہے (خود قرآن میں طائفتان کا لفظ آیا ہے۔ امام نیشاپوری اپنی تفسیر غرائب القرآن میں اس مقام کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اعلم ان الباغیۃ فی اصطلاح الفقہاء فرقۃ خالفت الامام بتاویل باطل بطلانا بحسب الظن لا القطع ..... ولابد ان یکون لہ شوکۃ وعدد یحتاج الامام فی دفعھم الی کلفۃ ببذل مال او اعداد رجال فان کانوا افراداً یسھل

واضح رہے کہ فقہاء کی اصطلاح میں باغیوں سے مراد ایسا گروہ ہے جو امام کی مخالفت باطل تاویل کی بنا پر کرے مگر اس کا بطلان ظنی ہو، قطعی نہ ہو ..... اس گروہ کے باغی قرار پانے کے لیے لازم ہے کہ اس کے پاس اتنی طاقت اور تعداد ہو کہ امام کو ان کے دفع کرنے کے لیے مال خرچ کرنے اور جمعیت فراہم کرنے کی زحمت میں مبتلا ہونا پڑے۔ اگر وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضبطهم فليسوا باهل بغي۔ | چند افراد ہوں جن کا قابو کر لینا آسان ہو، تو ان پر اہل بغاوت کا اطلاق نہیں ہو گا۔

ردّ المختار، باب البغاۃ میں باغیوں کی جامع تعریف یہ بیان کی گئی ہے:

اهل البغي كل فئة لهم منعة يتغلبون و يجتمعون ويقاتلون اهل العدل بتأويل يقولون الحق معنا ويدعون الولاية۔ | اہل بغاوت ہر وہ گروہ ہے جو زبردست طاقت کا مالک ہو، غلبہ و تسلط رکھتا ہو، اجتماعی ہیئت کا حامل ہو اور اہل عدل کے مقابلے میں تاویل کے بل پر قتال کرے اور اس کے افراد یہ کہیں کہ حق ہمارے ساتھ ہے اور وہ حکمرانی کے مدعی ہوں (رد المختار، ج ۳، ص ۴۲۷)۔

اس طرح کے سیاسی مجرمین بلاشبہ شرعاً قابل مواخذہ ہیں۔ لیکن ان لوگوں کے کچھ سیاسی، شہری اور مدنی حقوق بھی ہیں جن کو ہمارے ائمۂ سلف نے نہایت تفصیل سے بیان کر دیا ہے اور چھوٹتے ہی مدیرِ "البلاغ" کی طرح بس یہ فتویٰ نہیں داغ دیا کہ جہاں ایک مجمع نے چند نعرے لگا دیے، کسی افسر پر دو ڑھیلے پھینک دیے یا آوازے کس دیے، فوراً ہی سب جرمِ بغاوت کے مرتکب ہو گئے اور بغاوت کی سزا اسلام میں موت ہے! اگر عثمانی صاحب کے لیے یہ بات ناگوار خاطر نہ ہو تو میں یہ بھی واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ فقہائے کرام نے اسلامی قانونِ بغاوت کے جملہ قواعد و ضوابط امیر معاویہؓ کے بجائے حضرت علیؓ کے اُسوہ اور اُس طرزِ عمل کی روشنی میں مرتب کیے ہیں جو آپ نے اپنے خلاف لڑنے والوں کے معاملے میں اختیار کیا[1] اور ان مخالفین و مقاتلین میں امیر معاویہؓ بھی شامل تھے۔ بغاوت کے قانون کا خلاصہ یہ ہے کہ خروج کرنے والے جب تک محض اپنے فاسد عقائد یا حکومت اور اس کے سربراہ کے خلاف باغیانہ و معاندانہ خیالات کا اظہار کرتے رہیں، ان کو قتل یا قید نہیں کیا جا سکتا۔ جنگ یا تادیبی کارروائی اُن کے خلاف صرف اس وقت کی جائے گی جب وہ عملاً مسلح بغاوت کر دیں یا خونریزی کی ابتدا کر بیٹھیں۔ فقہاء نے اسلحہ کی تعریف بھی کر دی ہے۔ چنانچہ امام سرخسیؒ، المبسوط، ج ۹، ص ۱۲۱ پر فرماتے ہیں فاما الخشب والحجر لا يكون مثل السلاح (لکڑی

---

[1] صاحب ہدایہ باب البغاۃ میں حضرت علیؓ کے متعلق لکھتے ہیں:

هو قدوتنا في هذا الباب (حضرت علیؓ اس معاملے میں ہمارے لیے قابلِ تقلید نمونہ ہیں)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لاٹھی اور پتھر ہتھیار کے مانند نہیں ہو سکتے)۔ سلاح سے مراد فقہاء کے نزدیک وہ تیز ہتھیار ہیں جو بالعموم قتل کے لیے استعمال ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ لاٹھی یا پتھر یا کسی دوسری وزنی شے سے اگر ایک شخص دوسرے کو قتل بھی کر دے تب بھی بعض فقہاء کے نزدیک اس کو قتل نہیں کیا جائے گا، بلکہ دیت وصول کی جائے گی کیونکہ ان اشیاء سے قتل عمد ثابت نہیں ہوتا۔

فتح القدیر، شرح ہدایہ اور دیگر کتب فقہیہ میں حضرت علیؓ کا یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ کوفہ کی مسجد میں بعض خوارج حضرت علیؓ پر سب و شتم کر رہے تھے اور کثیر الحضرمی اُسے سن رہے تھے۔ ایک شخص ان میں یہ بھی کہہ رہا تھا کہ میں خدا سے عہد کرتا ہوں کہ علیؓ کو ضرور قتل کروں گا۔ الحضرمی نے جب یہ دیکھا تو اس شخص کو پکڑ کر حضرت علیؓ کے پاس لے آئے۔ آپ نے کہا کہ اسے چھوڑ دو۔ کثیر الحضرمی کہنے لگے کہ اسے کیسے چھوڑ دیا جائے جبکہ یہ آپ کے قتل کی قسم کھا چکا ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا افاقتله ولم یقتلنی (کیا میں اسے قتل کروں حالانکہ اس نے مجھے قتل نہیں کیا)۔ کثیر کہنے لگے کہ یہ آپ پر سب و شتم کر رہا تھا۔ حضرت علیؓ کہنے لگے کہ تم چاہو تو اس پر جوابی سب و شتم کر لو، ورنہ چھوڑ ہی دو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے حوالے سے بزار اور حاکم نے روایت کیا ہے اور اسے ابوبکر الجصاص نے بھی نقل کیا ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا کہ میری امت میں باغیوں کے زخمیوں پر حملہ نہیں کیا جائے گا اور جو گرفتار ہو جائیں ان کو قتل نہیں کیا جائے گا (لا یتجہز جریحھم ولا یقتل اسیرھم) اسی طرح کی ہدایات حضرت علیؓ نے جنگ جمل اور دوسرے مواقع پر دی ہیں۔ مبسوط (ج ۱۰، ص ۱۲۶) میں امام سرخسیؒ فرماتے ہیں: کان علی رضی اللہ عنہ یحلف من یوسر منھم ان لا یخرج علیہ قط ثم یخلی سبیلہ (حضرت علیؓ باغیوں میں سے قید ہونے والوں سے قسم لیتے تھے کہ وہ ان پر کبھی خروج نہیں کریں گے، پھر ان کو رہا کر دیتے تھے)۔ ابن العربی مالکی سورۂ حجرات کی آیتِ بغی کی تشریح کرتے ہوئے احکام القرآن میں لکھتے ہیں: لا یقتل اسیرھم ولا یتبع منھزمھم لان المقصود دفعھم لا قتلھم (باغیوں کے قیدیوں کو قتل نہیں کیا جائے گا اور شکست خوردہ کا تعاقب نہیں ہوگا، کیونکہ مقصود دفاع ہے، ان کا قتل نہیں)۔ امام شافعیؒ کتاب الام (ج ۴ ص ۱۳۸) میں فرماتے ہیں: اھل البغی انما یحل قتالھم دفعا لھم عما ارادوا من القتال او امتناع من الحکم فاذا فارقوا تلک الحال حرمت دماؤھم (اہل بغی سے قتال صرف اس لیے جائز ہے کہ انہیں لڑنے کے ارادے سے یا حکومت کی مخالفت سے روکا جائے۔ جب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ اس روش سے باز آجائیں تو اُن کا خون بہانا حرام ہو جاتا ہے)۔

یہ بات پہلے بیان ہو چکی کہ جو لوگ کثیر التعداد اور جنگی سر و سامان سے آراستہ ہوں، صرف ان پر قانونِ بغاوت کا اطلاق ہوگا۔ یہ لوگ اگر امام عادل کے خلاف تاویلِ شرعی کے بغیر خروج کے مرتکب ہوں اور مارے جائیں تو مذہب حنفی کے مطابق ان کی نمازِ جنازہ جائز نہیں۔ المبسوط، باب صلوٰۃ الشہید میں باغی کے متعلق فرماتے ہیں: لا یُغسل ولا یُصلّی علیہ۔ دوسری طرف اسی باب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مسلک حنفی کے مطابق شہید کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی، پھر شہدائے اُحد وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں حضرت عمارؓ بن یاسر اور حضرت حُجرؓ بن عدی کا ذکر بھی زمرۂ شہداء میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ امام سرخسی فرماتے ہیں:

ولمّا استشهد عمّار بن یاسر بصِفّین قال لا تغسلوا عنّی دمًا ولا تنزعوا عنّی ثوبًا فانی التقی معاویۃ بالجادۃ وھکذا نقل عن حجر بن عدی۔

جب حضرت عمارؓ بن یاسر جنگ صفّین میں شہید ہونے لگے تو فرمایا کہ میرا خون نہ دھونا اور میرے کپڑے نہ اتارنا۔ میں اسی حال میں امیر معاویہؓ سے قیامت کو ملاقات کروں گا اور حجرؓ بن عدی سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔

پھر آگے چل کر باب الخوارج (ج ۱۰ ص ۱۳۱) میں تحریر کرتے ہیں:

و یصنع بقتلی اھل العدل ما یصنع بالشھید فلا یغسلون و یصلی علیھم ھکذا فعل علی رضی اللہ عنہ بمن قتل من اصحابہ و بہ اوصی عمار بن یاسر و حجر بن عدی و زید بن صوحان رضی اللہ عنھم حین استشھدوا .... ولا یصلّی علی قتلی اھل البغی۔

اور جو لوگ اہلِ عدل میں سے قتل ہوں، تو ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جو شہداء کے ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی غسل دیے بغیر ان کا جنازہ پڑھا جائے گا۔ حضرت علیؓ نے اپنے مقتول ساتھیوں کے ساتھ یہی کیا تھا اور عمار بن یاسر، حجر بن عدی اور زید بن صوحان رضی اللہ عنہم نے شہید ہوتے وقت یہی وصیت کی تھی .... اور جو لوگ باغیوں میں سے قتل ہوں ان پر نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔

اب ایک طرف شمس الائمہ سرخسی ہیں جو واضح الفاظ میں حضرت حُجرؓ بن عدی کو اہلِ بغی کے بجائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اہلِ عدل کی صف میں شمار کر رہے ہیں۔ انہیں شہید کا لقب دے رہے ہیں اور ان پر جنازہ پڑھنے کو مشروع قرار دے رہے ہیں (حالانکہ ان کے ہاں باغی مقتولوں کا جنازہ جائز نہیں) اور دوسری طرف مفتی زادہ محمد تقی عثمانی صاحب ہیں جو حضرت حجرؓ بن عدی کو باغی اور واجب القتل ثابت کرنے کی سعیٔ ناکام میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں! ایسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست۔

امام ابوالحسن الماوردی نے بھی الاحکام السلطانیہ میں جہاں باغیوں سے جنگ پر بحث کی ہے وہاں صاف لکھا ہے کہ باغیوں میں سے کوئی شخص زیادہ فتنہ میں حصہ لیتا ہو تو اس کو امام تنبیہاً سزا دے سکتا ہے مگر قتل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کا خون تین صورتوں کے سوا حلال نہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ باغیوں کی جنگ اور مشرکین و مرتدین کی جنگ میں آٹھ چیزیں مابہ الامتیاز ہیں۔ پہلی یہ کہ باغیوں کو سرکشی سے روکنا مقصود ہوتا ہے، قتل و ہلاک کرنا مقصود نہیں ہوتا اور مشرک و مرتد کا قتل بھی مقصود بالذات قرار دینا جائز ہے۔ دوسری یہ کہ باغی سامنا کریں تو قتل کیے جائیں، ورنہ نہیں اور مشرک و مرتد ہر طرح قتل کیے جا سکتے ہیں۔ تیسری یہ کہ باغیوں کے زخمی قتل نہ کیے جائیں اور مشرکین و مرتدین کے زخمی قتل کرنے جائز ہیں۔ جنگ جمل میں حضرت علیؓ نے اپنے نقیب کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا تھا کہ خبردار بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے، زخمی کو قتل نہ کیا جائے۔ چوتھی یہ کہ باغیوں کے قیدی محض بند کیے جائیں، مشرک و مرتد قیدی قتل کیے جا سکتے ہیں۔ باغی قیدیوں کے متعلق یہ ہے کہ جس کے بارے میں یہ اطمینان ہو کہ پھر باغیوں میں شریک نہ ہوگا، تو چھوڑ دیا جائے، ورنہ جنگ کا مطلع صاف ہونے تک قید رکھا جائے اور اس کے بعد چھوڑ دیا جائے۔ پھر محبوس رکھنا بھی جائز نہیں..... (بقیہ امور لونڈی غلام بنائے جانے اور غصب اموال وغیرہ سے متعلق ہیں)۔ الاحکام السلطانیہ مترجم، نفیس اکیڈمی ص ۱۰۱-۱۰۲ (عربی المطبعۃ المحمودیۃ، مصر ص ۵۶)۔

قاضی ابویعلیٰ محمد بن الحسین الفراء کی تالیف "الاحکام السلطانیہ"۔ باب قتال اہل البغی، میں یہی بات بیان فرمائی ہے۔ وہ ص ۳۹ پر لکھتے ہیں:

سلہ یہ امر واضح رہے کہ فقہاء کرام کے ہاں اہل العدل اور اہل البغی کی اصطلاحیں ایک دوسرے کے بالمقابل استعمال ہوتی ہیں۔ امام عادل اور ان کے ساتھیوں کو اہلِ عدل اور ان کے خلاف لڑنے والوں کو اہل بغی کہا جاتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وجاز للامام ان یعزر من تظاھر بالعناد بادواً وتعزیراً ولا یتجاوزہ الی قتل ولا حد لقول النبی صلی اللہ علیہ وسلم "لا یحل دم امرئ مسلم الا باحدی ثلاث کفر بعد ایمان وزنی بعد احصان وقتل نفس بغیر نفس (رواہ البخاری ومسلم وابو داؤد والترمذی والنسائی عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ)

اور امام کے لیے جائز ہے کہ وہ عناد کا مظاہرہ کرنے والے کی تادیب و تعزیر کرے مگر اُسے قتل یا حد کی سزا نہ دے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ مسلمان کا خون حلال نہیں ہے سوائے تین صورتوں کے، پہلی یہ کہ وہ ایمان لانے کے بعد کفر کا ارتکاب کرے، دوسری یہ کہ شادی کے بعد زنا کرے، تیسری یہ کہ وہ ایسے شخص کو قتل کرے جس نے کسی متنفس کو قتل نہ کیا ہو۔

پھر فرماتے ہیں:

لا یقتل اسراھم ویجوز قتل اسری اھل الحرب والمرتدین۔

باغیوں میں سے جو مسلمان اسیر کیے جائیں، وہ قتل نہیں کیے جائیں گے اور حربی کافروں اور مرتدوں کے قیدی قتل کیے جائیں گے۔

پھر باغیوں ہی کے متعلق لکھتے ہیں:

ویعتبر احوال من فی الاسر منھم فمن امنت رجعتہ الی القتال اطلق ومن لم تؤمن منہ الرجعۃ حبس حتی ینجلی الحرب ثم یطلق ولا یحبس بعدھا۔

باغیوں میں سے جو قید کیے جائیں ان کے حالات کو جانچا جائے گا۔ جن کے بارے میں اطمینان ہو کہ دوبارہ قتال نہیں کریں گے، انہیں رہا کر دیا جائے گا اور جن کے متعلق ایسا اطمینان نہ ہو انہیں اس وقت تک قید رکھا جائے گا جب تک کہ لڑائی کا خاتمہ نہ ہو جائے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد انہیں چھوڑ دیا جائے گا اور اس کے بعد قید نہیں رکھا جائے گا۔

ماوردی اور ابو یعلیٰ کے اس ارشاد سے یہ بات قطعی طور پر واضح ہے کہ مسلمان باغی کے لیے سزائے قتل تو درکنار، اُس کے لیے حبسِ دوام کی سزا بھی جائز نہیں ہے۔ اُسے یا تو گرفتاری کے بعد ہی رہا کر دیا جائے گا یا پھر خاتمۂ جنگ تک اُسے قید رکھا جائے گا اور بعد میں رہا کر دیا جائے گا۔

مسلمان کا قتل کن صورتوں میں جائز ہوتا ہے

بہرکیف سابق بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کتاب و سنت قتلِ مسلم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی اجازت صرف اُن صورتوں میں دیتی ہے جب کہ اُس نے قاتل یا سارق یا قاطع طریق کی حیثیت سے قتلِ نفس کا ارتکاب کیا ہو، یا شادی کے بعد زنا کیا ہو، یا اسلام لانے کے بعد ارتداد کی راہ اختیار کی ہو۔ جہاں تک بغاوت یا بغی کی اسلامی و شرعی اصطلاح کا تعلق ہے، اس کا اطلاق ہر فتنہ و فساد اور ہر شورش اور ہر ایجی ٹیشن پر نہیں ہو سکتا۔ اہلِ بغی سے مراد ایک ایسی طاقت ور جمعیت اور بھاری گروہ ہے جو اسلحہ یعنی آلاتِ جارحہ سے لیس ہو کر اور کسی سیاسی و اعتقادی تاویل کو سامنے رکھ کر اہلِ عدل کے خلاف باقاعدہ قتال کرے۔ اس طرح کے باغیوں کے گروہ کے خلاف لڑنے کا حکم اسلامی حکومت کو دیا گیا ہے۔ لڑائی کے دوران میں ان باغیوں کا قتل جائز ہے۔ لیکن لڑائی کے بعد زخمیوں، قیدیوں اور بھاگنے والوں کا قتل جائز نہیں۔ ان میں سے صرف وہی باغی گرفتار ہونے کے بعد قتل کیا جا سکتا ہے جس نے اس قتال سے قبل یا بعد میں کسی ایسے جرم کا ارتکاب کیا ہو جس کی سزا قتل ہو۔ یا پھر جس باغی کے سارے ساتھی قابو میں نہ آ سکتے ہوں اور اس کے زندہ رہنے کی صورت میں ان پر قابو پانا اور بغاوت کو فرو کرنا ممکن نہ ہو، اس باغی کا قتل بھی بعض فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔

یہاں ایک اعتراض یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر اسلام میں سزائے قتل صرف انہی جرائم پر دی جا سکتی ہے جو اوپر مذکور ہوئے تو پھر اُن احادیث کا مفہوم و مراد کیا ہے جن میں یہ فرمایا گیا کہ ایک خلیفۂ برحق کی موجودگی میں دوسرے مدعی کو مار دو، اس کی گردن تلوار سے اڑا دو۔ شارحینِ حدیث نے ان ارشاداتِ نبوی کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ایسے شخص کے خلاف دفاع و قتال کرو۔ امام نوویؒ نے مسلم، کتاب الامارہ میں فاضربوا عنق الآخر کے بعد لکھا ہے: معناہ ادفعوا الثانی فانہ خارج علی الامام فان لم یندفع الا بحرب وقتال فقاتلوہ۔ ایک خلیفہ کے مقابلے میں جب دوسرا مدعی کھڑا ہو جائے تو دوسرے کی گردن مارنے کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کو دفع کر دو وہ امام کے خلاف خروج کر رہا ہے۔ اگر جنگ کے بغیر اس کا دفعیہ ممکن نہ ہو تو اس سے لڑو۔ ملا علی قاریؒ شرح فقہ اکبر میں، نصب الامام کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں والامر بقتلہ محمول کما صرح بہ العلماء علی ما اذا لم یندفع الا بالقتل (حدیث میں دوسرے خلیفہ کو قتل کرنے کا جو حکم ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر قتل کیے بغیر دفاع ممکن نہ ہو، تب اُسے قتل کرو جیسا کہ علماء نے صراحت کی ہے)۔ اگر یہ مفہوم نہ ہو تو حضرت حجرؓ بن عدی کا معاملہ تو درکنار، انہیں قتل کی سزا دینے والے حضرت معاویہؓ خود حضرت علیؓ کے مقابلے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(معاذ اللہ) اس سزا کے مستوجب قرار پاتے ہیں، سالنہ کا قانون بے لاگ ہے۔ وہ اشخاص و افراد کو نہیں بلکہ افعال کو دیکھتا ہے۔ امام نوویؒ نے شرح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، مولفۃ القلوب) میں اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ خوارج و بغاۃ کے قیدیوں کو قتل کرنا جائز نہیں (لا یقتل اسیرہم)۔

اسی سلسلے کا ایک اشکال اور بھی ہے جس کی طرف اشارہ پہلے ہو چکا ہے۔ وہ یہ کہ بعض روایات میں ان تین یا چار صورتوں کے علاوہ بعض دوسرے افعال کے مرتکب کو قتل کرنے کا حکم بھی آیا ہے جس کے مطابق عمل کا فتویٰ بعض فقہاء نے دیا ہے۔ اسی طرح بعض فقہاء اس بات کے بھی قائل ہوئے ہیں کہ بعض حالات میں پھانسی یا قتل کی سزا بطورِ تعزیر بھی دی جا سکتی ہے جسے وہ سیاسۃً قتل کا عنوان دیتے ہیں۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ بعض احادیث میں جن جرائم پر قتل کی وعید ہے وہ بالعموم ان تین صورتوں کے مشابہ ہیں جن پر سزائے قتل بلا اختلاف و اشتباہ سنت نبوی سے ثابت ہے مگر یہ جرائم ایسے غیر فطری، گھناؤنے یا نادر الوقوع ہیں کہ غالباً اسی بناء پر شارع نے ان کا ذکر ثلاث خلال کے ساتھ مناسب یا ضروری خیال نہیں فرمایا۔ مثال کے طور پر محرمات یا جانوروں یا مردوں سے بدفعلی، ساحری، جاسوسی کے جرائم پر بعض فقہاء نے قتل کی سزا تجویز کی ہے کیونکہ یہ کسی نہ کسی اعتبار سے ان افعال کے ساتھ ملحق ہو سکتے ہیں جن پر قتل کی حد مقرر ہے۔ اسی طرح جو مجرم بار بار ایسے جرائم کا ارتکاب کرے جو موجب حد ہوں اور قتل سے کم درجے کی سزا اُسے باز نہ رکھ سکے۔ مثلاً وہ بار بار چوری یا رہزنی کا مرتکب ہو، تو ایسے عادی مجرم کا قتل بھی بعض فقہاء کے نزدیک جائز ہے اور بعض ارشاداتِ نبوی سے بھی ایسے مجرمین کے قتل کا جواز نکلتا ہے۔

تعزیری قتل کی ان شکلوں اور ان کے جواز و عدم جواز کا کوئی تعلق قانونِ بغاوت سے نہیں ہے، اور حضرت حُجرؓ بن عدی کے قتل کا جواز مدیرِ "البلاغ" جرم بغاوت کے تحت ثابت کرنا چاہتے ہیں، اس لیے میرے لیے سیاسۃً اور تعزیراً قتل کا مسئلہ چھیڑنا غیر ضروری تھا تاہم میں نے رفع اشکالات اور قارئین کے ذہنوں کو صاف رکھنے کے لیے اس پہلو کا ذکر بھی بالاختصار کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ فقہاء و محدثین کی اکثر تعداد بہر حال ایسی ہے جو قتلِ مسلم کا جواز فقط انہی تین صورتوں تک محدود رکھتی ہے جو مذکورہ بالا مشہور اور صحیح ارشاد نبوی میں بیان ہوئے ہیں اور جیسے حضرت عثمانؓ نے اپنے محاصرے کے دوران میں باغیوں کے سامنے پیش فرمایا تھا۔ چوتھی جائز صورت دفاعی قتل کی ہے، یعنی ایک مسلمان اگر جارحانہ، باغیانہ یا محاربانہ حیثیت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں سامنے آکھڑا ہو تو اس کے حملے کو دفع کرتے ہوئے اُسے قتل کرنا جائز ہوگا۔ فقہاء کے اس دوسرے گروہ کے نزدیک ان حالتوں کے ماسوا ایک مسلمان پر کوئی ایسی حد یا تعزیر نافذ نہیں کی جا سکتی جس کا مقصد اس کی جان کو ہلاک کرنا ہو۔ البتہ اس کی زندگی کو باقی رکھتے ہوئے شدت جرم کے لحاظ سے اُسے بڑی سے بڑی سزا دی جا سکتی ہے۔ قاضی ابو یعلیٰ کا قول پہلے نقل کیا جا چکا ہے جس سے تعزیری قتل کا عدم جواز ثابت ہوتا ہے۔ امام ماوردی نے بھی الاحکام السلطانیہ میں یہی بات لکھی ہے۔ اس کتاب کی فصل التعزیر میں وہ فرماتے ہیں کہ لا یجوز ان یبلغ بالتعزیر انہار الدم (تعزیر کے ذریعے سے خون بہانا جائز نہیں ہے)۔

کیا حضرت حُجرؓ شرعاً واجب القتل تھے؟ گزشتہ بحث سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آ چکی ہے کہ حکومت وقت پر تنقید اور اس کے خلاف مزاحمت و تحریک کی ہر شکل و صورت، حتیٰ کہ شورش و بدامنی کا ہر اقدام بھی قانون شریعت کی نگاہ میں بغاوت (SEDITION OR REVOLT) کی تعریف میں نہیں آ سکتا۔ اسلام میں جرم بغاوت کے متحقق ہونے کے لیے چند شرائط لازم ہیں، جن میں اہم ترین شرطیں دو ہیں۔ پہلی یہ ہے کہ مجرمین جبر و تشدد کے ذریعے سے حکومت کا تختہ الٹنا چاہیں، عدم اطاعت کی روش سے نظم حکومت کو درہم برہم کر دینا ان کا مقصود ہو اور امام عادل کے خلاف وہ کھلم کھلا اور مسلح خروج کا ارتکاب کریں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ اپنی تعداد، تنظیم اور جنگی ساز و سامان کے لحاظ سے اتنی سیاسی و مادی طاقت و شوکت کے مالک ہوں کہ انہیں حربی کارروائی کے بغیر آسانی سے قابو میں نہ لایا جا سکتا ہو۔ اگر یہ بنیادی شرائط موجود نہ ہوں تو مجرمین پر قانون بغاوت کا اطلاق نہ ہوگا؛ بلکہ وہ محاربہ، فساد، سرقہ، رہزنی وغیرہ سے متعلق دوسرے قوانین شرعیہ کے تحت ماخوذ ہوں گے۔ اس کے ساتھ دوسری حقیقت جو میری بحث سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام میں فعل بغاوت فی نفسہٖ موجب قتل نہیں ہے۔ اسلام نے ہر باغی کو پکڑ کر قتل کرنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ حکم یہ دیا ہے کہ باغی گروہ کے خلاف قتال کرو، ان سے لڑو، یہاں تک کہ وہ پسپا اور مطیع ہو جائیں۔ قتال کے دوران میں جو باغی قتل ہو جائے،

۱؎ علمائے سلف نے اپنی تحریروں میں کہیں کہیں بغی، محاربہ اور فساد فی الارض وغیرہ الفاظ کو مترادف و ہم معنی بھی استعمال کیا ہے، لیکن خالص قانونی و فقہی مباحث میں جہاں انہوں نے ان اصطلاحات کی تعریف بیان کی ہے وہاں ایک کو دوسری سے بالکل ممیّز کر دیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو جائے۔ لیکن جو زخمی یا اسیر یا مفرور ہو جائے، اُسے گرفتاری کے بعد قتل کرنا جائز نہیں، الّا یہ کہ اُس کے ساتھی بھاری تعداد میں آزاد رہ جائیں اور اُن پر قابو پانے کے لیے اس قیدی کا خون بہانا بالکل ناگزیر ہو۔ اس بحث میں ضمناً یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ مسلمان کا قتل صرف تین حالتوں میں جائز ہے، ایک یہ کہ وہ نکاح کے بعد زنا کرے، دوسری یہ کہ وہ کفر و ارتداد اختیار کرے، تیسری یہ کہ وہ ناحق قتلِ عمد کا مرتکب ہو۔ "البلاغ" میں حضرت حجرؓ بن عدی کو باغی اور واجب القتل ثابت کرنے میں جو بیس سے زائد صفحات سیاہ کیے گئے ہیں، اپنی اب تک کی بحث کی روشنی میں میرے لیے ان کے جواب میں فقط یہ کہہ دینا کافی ہو سکتا ہے کہ حضرت حجرؓ بن عدی یا اُن کے کسی رفیق کے کسی فعل پر بھی بغاوت کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا اور بالفرض اگر ان کا کوئی فعل بغاوت کی تعریف میں آتا تھا، تب بھی گرفتار ہو جانے کے بعد ان کا قتل از روئے اسلام ہرگز جائز نہیں تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ عثمانی صاحب نے اس طویل خامہ فرسائی میں استدلال کے جو جوہر دکھائے ہیں اور حضرت حجرؓ کو مباح الدم ثابت کرنے میں جس طرح ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے، اس سے بالکل صرفِ نظر کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اب میں اس پر بھی اپنا جائزہ پیش کرتا ہوں۔

حضرت حجرؓ کا مرتبہ گھٹانے کی کوششیں مولانا محمد تقی صاحب نے اپنی بحث کا آغاز اس شکایت سے کیا ہے کہ مولانا مودودی نے اس واقعے میں چند باتیں ایسی لکھی ہیں جن کا ثبوت کسی بھی تاریخ میں نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے پوری بحث میں صرف ایک ایسی بات کی نشان دہی کی جو ان کے نزدیک تاریخ کی کسی کتاب میں مذکور نہ تھی اور وہ تھا حضرت عائشہؓ کا یہ قول کہ "اے معاویہؓ، تمہیں حجر کو قتل کرتے ہوئے خدا کا خوف نہ ہوا"۔ لیکن اس قول کا بھی تاریخ میں مذکور ہونا اب خود انہوں نے جمادی الاُخریٰ کے "البلاغ" میں تسلیم کر لیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جناب محمد تقی صاحب نے چند بلا ثبوت "باتوں" کا ذکر جو بصیغۂ جمع کیا تھا وہ آخر کیا تھیں؟ اگر حضرت عائشہؓ کے اس قول کے علاوہ بھی مولانا مودودی کی نقل کردہ کسی بات کا حوالہ انہیں اب تک کسی کتاب میں نہ ملا ہو، تو براہ کرم وہ اس کی نشان دہی فرما دیں، ورنہ آئندہ ایسے غیر محتاط اور مبالغہ آمیز دعووں سے پرہیز کریں تو بہتر ہے۔

عثمانی صاحب کا دوسرا شکوہ یہ ہے کہ "مولانا مودودی نے حضرت حجر بن عدی کو "علی الاطلاق" زاہد و عابد صحابی کہہ دیا ہے، حالانکہ ان کا صحابی ہونا مختلف فیہ ہے۔ ابن سعدؒ اور مصعبؒ زبیری کا کہنا تو یہی ہے کہ یہ صحابی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے لیکن امام بخاریؒ، ابن ابی حاتمؒ اور ابن حبانؒ نے انہیں تابعین میں شمار کیا ہے اور ابو احمد عسکری کے نزدیک اکثر محدثین ان کا صحابی ہونا صحیح قرار نہیں دیتے۔" لیکن حضرت حجرؓ بن عدی کے متعلق جو کچھ محدثین و مورخین نے لکھا ہے اگر اُسے بحیثیت مجموعی سامنے رکھا جائے تو عثمانی صاحب ہی کے الفاظ میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے محدثین کی تحریروں کے "ضروری اجزاء حذف کر کے بڑا ہی خلاف واقعہ تاثر قائم کیا ہے"۔ البدایہ اور الاصابہ سے انہوں نے وہ اقوال تو نقل کر دیے جو حضرت حجرؓ کی صحابیت کے متعلق اشتباہ پیدا کرتے ہیں لیکن ان اقوال کو چھوڑ دیا ہے جو ان کا صحابی ہونا ثابت کرتے ہیں۔ مثلاً البدایہ کے جس صفحے کا حوالہ انہوں نے دیا ہے، اس کے شروع ہی میں درج ہے قال ابن عساکر وفد الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم (ابن عساکر نے فرمایا کہ حضرت حجرؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے)۔ اسی طرح مرزبانی کا یہ قول بھی منقول ہے کہ حجر بن عدی وفد الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مع اخیہ ھانی بن عدی (حجر بن عدی اپنے بھائی ھانی بن عدی کے ساتھ وفد کی صورت میں خدمت نبوی میں حاضر ہوئے تھے)۔

حافظ ابن عبدالبر الاستیعاب میں فرماتے ہیں کان حجر من فضلاء الصحابۃ۔ (حجرؓ صاحب فضیلت صحابہ میں شامل تھے)۔ پھر وہ امام احمد کے حوالے سے یحییٰ بن سلیمان کا قول نقل کرتے ہیں کہ حجر بن عدی مستجاب الدعوۃ اور افاضل اصحاب النبیؐ میں سے تھے۔ اس کے بعد استیعاب میں ابن نافع سے منقول ہے کہ وہ حضرت حجرؓ کو رجل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم قرار دیتے ہوئے ان سے ایک حدیث روایت کرتے ہیں کہ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم "ان قوما یشربون الخمر یسمونھا بغیر اسمھا"۔

حافظ ابن حجرؒ نے الاصابہ میں امام حاکم کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت حجرؓ اور ان کے بھائی حضرت ھانیؓ بن عدی وفد کی صورت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لائے تھے۔ پھر ابن حجرؒ نے ابوبکرؓ بن حفص کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضرت حجرؓ کو صحابی قرار دیتے ہوئے ان سے ایک حدیث روایت کی ہے کہ:

ان قوما یشربون الخمر یسمونھا بغیر اسمھا۔

صحابہ کرامؓ کے سوانح پر مشتمل تیسری مشہور کتاب اُسد الغابہ ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ حضرت حجر کا لقب حجر الخیر (نیکو کار حجر) مشہور تھا اور آپ اپنے بھائی کے ساتھ آنحضورؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تھے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

افاضل صحابہ اور اعیان صحابہ میں شمار کیے جاتے تھے۔

امام حاکم نے اپنی کتاب المستدرک، ج ۳ میں صحابہ کے حالات بیان کرتے ہوئے صفحہ ۴۶۸ پر ایک باب کا عنوان قائم کیا ہے: مناقب حجر بن عدی رضی اللہ عنہ وھو راھب اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم (حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے مناقب جو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے درویش صفت اور زاہد منش انسان تھے)۔ امام ذہبی کی تلخیص مستدرک میں بھی یہی عنوان باب موجود ہے اور انہوں نے حاکم کے اس بیان سے اختلاف نہیں کیا ہے۔

اب ان سارے محدثین و مؤرخین کی تصریحات کے بعد آخر یہ بات کیسے درست ہو سکتی ہے کہ "اکثر محدثین" حضرت حجرؓ کا صحابی ہونا صحیح تسلیم نہیں کرتے اور عثمانی صاحب کا یہ شکوہ کیسے بجا ہو سکتا ہے کہ مولانا مودودی نے انہیں "علی الاطلاق" زاہد و عابد صحابی کہہ دیا ہے۔ اگر عثمانی صاحب بُرا نہ مانیں تو میں عرض کروں کہ انہوں نے حضرت حجرؓ کی صحابیت کو مشکوک بنانے کے لیے یہ سارا زور اس لیے صرف فرمایا ہے کہ ایک صحابی کو واجب القتل مجرم ثابت کرنے سے ان کی یہ پوزیشن مجروح ہوتی جا رہی تھی[1] ان کے اس مضمون کا محرک واقعی حمایتِ صحابہ کا جذبہ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک صحابی کی خاطر دوسرے صحابی کو مجرم ثابت کرنے والا آدمی حمایتِ صحابہ کا علمبردار تو نہیں بن سکتا۔

(باقی)

---

[1] صحابیت کا مطلق یا غیر مطلق و مشروط ہونا یہ ایک نرالی اصطلاح ہے جو پہلی مرتبہ سامنے آئی ہے۔

استدراک | اس مضمون کی قسطِ سابق کے ایک مقام پر میں نے ضمناً چند علمائے کرام کے اسمائے گرامی لکھے تھے جن کے نزدیک عورت کی سربراہی مملکت جائز تھی۔ ان میں جناب مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کا نام بھی تھا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مولانا محترم نے اس کا انکار فرمایا ہے۔ اس تسامح پر میں اللہ سے معافی اور مولانا موصوف سے معذرت کا طلب گار ہوں اور قارئین سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ جمادی الاولیٰ کے ترجمان صفحہ ۳۵ پر ضروری تصحیح کرلیں۔ (غلام علی)

© rasailojaraid.com